آخری دیوار

برصغیر میں پُر تشدد فرقہ واریت کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ عمومی طور پر پاکستان کی آزادی تک ہمیں عقیدہ اور فرقہ کی بنیاد پر باہمی خلفشار کی محض چند مثالیں ہی نظر آتی ہیں۔ شیعہ اور سنی لوگ بڑی آسائش کے ساتھ ایک دوسرے کے ہمراہ زندگی گزار رہے تھے۔

انگریز کی غلامی کو ختم کرنے کیلئے برصغیر میں مختلف مذاہب کے پیروکار لڑتے رہے۔ آپ 1857ء کی جنگ آزادی کا بغور جائزہ لیجئے۔ آپ میرٹھ سے اس جنگ کے آغاز کو تدبر سے پڑھیے۔ آپ حیران رہ جائینگے کہ مختلف مذاہب کے لوگ یک جان ہو کر باغی ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک جنگ کا آغاز ہو گیا۔ اس نکتہ پر لکھنے کیلیے دفتر چاہئیں مگر آج طالبعلم کا مقصد بالکل کچھ اور ہے۔ ماضی میں مسلمانوں کے دل ایک دوسرے کیلئے کھلے تھے۔ خوبصورت ترین بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں آج بھی یہ فضا موجود ہے۔ دونوں طرف کچھ لوگ ایسے ضرور موجود ہیں جو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی ہر پُر تشدد کوشش کرتے ہیں۔ پُرامن فضا کو قائم رکھنے اور اسکو مضبوط کرنے میں ہمارے صوفیاء اکرام کا بہت ہاتھ ہے۔ حضرت داتا گنج بخش، بابا فرید، نظام الدین اولیاء اور دیگر باکمال لوگ اسی ہار کے وہ نایاب موتی ہیں جنہوں نے ہمارے خطہ میں اسلام سے محبت کرنے والی تصویر پیش کی۔

آپ چار سے پانچ دہائیوں پہلے کا پاکستان دیکھیے۔ میرے بچپن کے پہلے چند برس جناح کالونی لائل پور (فیصل آباد) میں گزرے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ محرم کے دس دن تمام لوگ ایک غم کے عالم میں مناتے تھے۔ کیا سنی اور کیا شیعہ، اس میں کوئی تفریق نہیں تھی۔ دس محرم کا جلوس جناح کالونی کی مین شاہراہ سے گزرتا ہے۔ میں اس وقت آٹھ سال کا تھا۔ اس دن ہمارے بزرگوں کے کہنے پر ہم تمام بچے گھروں کے باہر پانی کی سبیلیں لگاتے تھے۔ جیسے ہی دس محرم کا جلوس محلّہ سے گزرتا تھا، گھر کے تمام بزرگ باہر آجاتے تھے۔ ہم لوگ جلوس کے شرکاء کو ایک ہی گلاس سے پانی اور شربت پلاتے رہتے تھے۔ تمام بچے جلوس گزرنے کے بعد مل کر گورنمنٹ کالج کے نزدیک امام بارگاہ چلے جاتے تھے۔ وہاں کھڑے ہو کر جلوس کے اختتام کو غور سے دیکھا کرتے تھے۔

ڈویژنل پبلک سکول میں چوہدری اصغر پرنسپل تھے۔ انکی اہلیہ انگریز تھیں۔ وہ کیمرج لندن کے فارغ التحصیل تھے۔ پورے اسکول میں کسی کو یہ تجسس نہیں تھا کہ دوسرے طالبعلم کی ذات کیا ہے اور اسکا مسلک کیا ہے۔ ڈویژنل پبلک سکول سے کیڈٹ کالج حسن ابدال تک کا سفر مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ حسن ابدال میں بھی مجھے کسی قسم کا کوئی واقعہ یاد نہیں ہے کہ کوئی بھی طالبعلم ایک دوسرے کا مسلک معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ سب بچے اور اساتذہ ایک ہی مسجد میں نماز ادا کرتے تھے۔ کسی قسم کی کوئی مذہبی تفریق نہیں تھی۔ تیس برس گزرنے کے بعد بھی مجھے اب تک یہ پتہ نہیں کہ ہمارے اساتذہ اور ہمارے ہم عصر بچے شیعہ تھے یا سنی۔ ہمارے تاریخ کے استاد جی لارنس تھے اور کمال کے استاد تھے۔ ایک عظیم محقق اور لاجواب انسان۔ کسی طالبعلم کے ذہن میں انکے متعلق یہ سوال نہیں تھا کہ وہ غیر مسلم ہیں اور تاریخ کی تعلیم دے رہے ہیں۔ تمام لوگ ایک دوسرے کو برابر کا انسان سمجھتے تھے۔ کوئی نسلی، مذہبی یا فرقہ کا کوئی مسئلہ تک نہیں تھا۔ لوگوں میں برداشت کا مادہ بہت زیادہ تھا جو مجھے اب کم ہوتا ہوا نظر آرہا ہے۔ مگر ختم نہیں ہوا۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں بھی بالکل یہی حال تھا۔ سب طالبعلم اور اساتذہ ایک طرح کے رویہ کے حامل تھے۔ میڈیکل کالج کے ہاسٹل میں ایک ہی کمرے میں سالہا سال رہتے ہوئے روم میٹ کے مسلک کا پتہ نہیں تھا۔ بہت بڑی بات یہ ہے کہ کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ سول سروس میں ملتان میں پہلی پوسٹنگ پر مجھے اندازہ ہوا کہ محرم میں بہت زیادہ حفاظتی اقدامات لیے جاتے ہیں۔ مگر محرم آتا تھا اور چلا جاتا تھا مگر فرقہ واریت کے عذاب کو میں نے بہاولپور میں اپنی آنکھوں سے پہلی بار دیکھا۔ میں وہاں ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر تھا۔ جاوید اعوان صاحب ڈپٹی کمشنر تھے۔ چھوٹی عید پر وہ اور اس وقت کے ایس پی شاہد صاحب چھٹیوں پر گئے ہوئے تھے۔ میں پولیس لائن میں عید کی نماز پڑھ رہا تھا کہ اطلاع ملی کہ اہل تشیع کی مسجد میں کسی نے گرنیڈ پھینک دیے ہیں۔ اس مسجد میں پہنچنے والا پہلا شخص میں تھا۔ آپ کو بیان نہیں کر سکتا کہ میں نے کتنے غم ناک اور رقت انگیز مناظر دیکھے۔ مسجد کے صحن میں چھ سات لاشیں پڑی ہوئیں تھیں۔ جس میں ایک سات سال کے بچے کی چھوٹی سی لاش بھی تھی۔ زخمی تڑپ رہے تھے۔ ہر طرف خون ہی خون تھا۔ مسجد کے بالکل نزدیک میڈیکل کالج تھا۔ پچیس سال قبل ضلعی انتظامیہ کے وسائل بہت محدود تھے۔ فی الفور زخمیوں کو ہسپتال پہنچایا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ خون کا عطیہ دینے والے نوجوانوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ ہر نوجوان کی خواہش تھی کہ اسکا خون لیا جائے تاکہ انسانی جان بچ جائے۔ یہ مروت اور سلوک کا اثر انگیز مظاہرہ تھا اور اس میں کسی قسم کی کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ مگر اس اندوہناک دن میں ایک اور واقعہ میرے ذہن پر آج بھی نقش ہے۔ دوپہر کو جب لواحقین کو نعشیں دی گئیں تو معصوم بچے کے جسم کو میں خود اسکے گھر لیکر گیا۔ گھنٹی بجانے پر عمر رسیدہ دادی باہر نکلیں۔ جب میں نے انہیں یہ المیہ سنایا تو وہ کہنے لگیں کہ یہ ہو نہیں سکتا کیونکہ بچہ ایک گھنٹہ پہلے گھر میں سیب کھا رہا تھا۔ اس نے صرف آدھا سیب کھایا تھا اور آدھا سیب ابھی بھی پلیٹ میں پڑا ہوا ہے۔ ضد کر کے گیا تھا کہ وہ باقی سیب نماز سے واپس آکر کھائے گا۔ یہ سنکر تمام لوگ آب دیدہ سے ہوگئے۔ گھر کے صحن میں ایک پلیٹ پر واقعی آدھا سیب پڑا ہوا تھا۔ یہ حملہ ایک دہشت گرد تنظیم نے کیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں تمام ملزمان پکڑے گئے اور تمام کے تمام کو سزا ہوئی۔ یہ واقعہ میری زندگی میں ایک آنکھیں کھول دینے والا سانحہ تھا۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ لوگ ہم مذہب ہونے کے باوجود صرف عقیدہ کی بنیاد پر ایک دوسرے کی جان لے سکتے ہیں۔ معصوم بچوں تک کو لقمہ اجل بنا سکتے ہیں۔ یہ پچیس برس پہلے کی بات ہے۔ بعد کے حالات آپ مجھ سے بہت بہتر جانتے ہیں۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہم پر ایک فرقہ وارانہ جنگ مسلط کی گئی۔ مسلک کی بنیاد پر ہزاروں لوگوں کو شہید کیا گیا۔ پندرہ سال قبل کی فرقہ وارانہ لڑائی اور آج کی خوفناک جنگ میں بہت فرق ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ہے کہ ہماری حکومتیں اس عفریب سے نبرد آزما ہونے کیلئے فوج کا سہارا لے رہی ہیں۔ میں یہ عرض کرتا چلوں کہ یہ ملک کی آخری دفاعی لائن ہے۔ ہم اس جنگ میں ہارنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔

میں نے اب تک جو تمہید عرض کی، اسکا مقصد صرف ایک تھا۔ ہم عمومی طور پر کبھی بھی مسلک کی بنیاد پر قتال میں شامل نہیں ہوئے۔ مگر یہ تصویر بین الاقوامی تناظر میں بالکل مختلف ہے۔ سعودی عرب اور ایران کی آپس کی جنگ اب دنیا کا سب سے بڑا خطرہ بن چکی ہے۔ اس جنگ کا ایک بہت بڑا فریق آئی ایس آئی ایس یا داعش ہے۔ مسلمانوں کو ایک باہمی خلفشار میں انتہائی کامیاب مگر خوفناک حکمت عملی کے تحت اس طرح دھکیل دیا گیا ہے کہ جیت بھی مسلمانوں کی ہے اور ہار بھی انکی۔ داعش کو کس نے بنایا؟ اسکے امیر کو کہاں سے لایا گیا؟ یہ اب تمام دنیا کو معلوم ہو چکا ہے۔ پھر سرمایہ کے بل بوتے پر تمام دنیا سے مجاہدین کو داعش کے علاقہ میں پہنچایا گیا۔ یہ اب کوئی راز نہیں ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان کی جیل میں سے طاقت کے زور پر نکلنے والے دہشت گرد اب کس ملک میں لڑ رہے ہیں، یہ سب کے علم میں ہے۔ انتہائی منظم طریقے سے مشرق وسطیٰ میں شیعہ سنی جنگ اس نہج پر لیجائی جا رہی ہے کہ پوری اسلامی دنیا اسکی لپیٹ میں آسکتی ہے۔ اس جنگ کا آغاز تو خیر اب سب کے علم میں ہے مگر اسکا انجام کیا ہوگا، کسی کے علم میں نہیں۔ اس خطرناک کھیل کی چاپ اب ہمارے ملک میں بھی سنائی دے رہی ہے۔ ملک کے واحد ادارہ یعنی فوج نے جس طرح دہشت گردی کے ساتھ فرقہ واریت کو بھی شامل کیا ہے، وہ ایک قابل تحسین بات ہے۔ اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے کسی بھی سول ادارہ میں اتنی قوت نہیں کہ وہ مخالف پر فیصلہ کن ضرب لگا سکے۔ صوبائی سطح پر قانون نافذ کرنے والے اداروں کی کمزوری اور مکمل طور پر پست سیاسی قوتیں اس جنگ میں کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں۔ بچا کھچا کر اب صرف فوج ہی وہ ادارہ رہ جاتا ہے جسکے کندھوں پر یہ بھاری ذمہ داری آن پڑی ہے۔ اس جنگ کی اصل اور واحد قیادت صرف اور صرف فوج کے پاس ہے۔ باقی سب کچھ زیب داستان کیلئے ہے۔ اصل بلکہ باریک نقطہ بھی یہی ہے کہ فوج کو اندازہ ہو چکا ہے کہ فرقہ واریت کا جن ملک کے لیے خطرناک ثابت ہو چکا ہے۔ ملک کی حفاظت کرنا، بہر حال انکے پیشہ وارانہ فرائض میں شامل ہے۔

داعش کے ساتھ جنگ ہمارے صحن سے کچھ دوری پر ہے۔ یہ جنگ بالکل غیر متوقع رخ اختیار کر سکتی ہے۔ کچھ دانشوروں کا خیال یہ بھی ہے کہ یہ تیسری جنگ عظیم کی شروعات ہے۔ اس جنگ کے دامن سے نکلنے والی چنگاریاں پوری دنیا میں آگ لگا سکتیں ہیں۔ شام اور عراق میں قائم اس اسلامی حکومت سے جہاں شام کی فوج لڑ رہی ہے، وہیں ان کے ساتھ کرد بھی اس لڑائی میں فیصلہ کن کردار ادا کر رہے ہیں۔ شائد آپکے لیے یہ حیرانگی کی بات ہو کہ کردوں میں شیعہ اور سنی دونوں عقائد کے لوگ ہیں۔ انکو بھرپور بین الاقوامی مدد مل رہی ہے۔ طالبعلم کی دانست میں ملنی بھی چاہیے۔ داعش کے پاس اعلیٰ ترین امریکی ہتھیار ہیں۔ میزائل اور توپیں ہیں۔ یہ تمام جدید ترین اسلحہ دراصل داعش نے عراقی فوج سے حاصل کیا ہے۔ کوبانی شام کے بارڈر پر واقع ایک انتہائی اہم فوجی قصبہ ہے۔ ستمبر میں اس پر داعش نے قبضہ کر لیا تھا۔ مقامی کردوں کے لشکر نے پانچ ماہ تک اس شہر کو حاصل کرنے کیلئے بہت شدید یلغار کی۔ انکی جنگ محلّہ محلّہ اور گلی گلی میں جاری رہی۔ نتیجہ میں چند دن پہلے کوبانی پر کردوں نے قبضہ کر لیا۔ داعش کو وہاں پر شدید ترین شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ لیکن اب اس پورے علاقے یعنی شام اور عراق میں بدترین شیعہ سنی جنگ شروع ہو چکی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف ظلم اور جبر کی اندوہناک تاریخ رقم کر رہے ہیں۔ نقصان اس وقت اس معصوم شہری آبادی کا ہو رہا ہے جسکے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ انہیں اس جنگ کا ایندھن بننا ہی بنتا ہے۔ موت کے علاوہ ان شہریوں کے پاس کوئی راستہ نہیں۔ کوئی بھی راستہ!

اپنے ملک میں طالبعلم کی رائے میں اس جنگ کے آنے کا امکان بہت دور کا ہے۔ اسکی واحد وجہ ہمارے لوگوں کا عمومی متوازن سماجی رویہ ہے۔ اگر دہشت گردوں کی تعداد پر غور کیا جائے تو وہ ایک فیصد سے بھی کم ہیں۔ ایسی اقلیت کو فنا کرنے کیلئے ہمارے پاس بہت مضبوط اور قابل اعتبار فوجی طاقت ہے۔ ہمارے معتدل رویہ کی بدولت ہمارے تمام دشمن پریشان ہو چکے ہیں۔ ہم ہر وار سینے پر سہتے ہیں، روتے ہیں، گریہ کرتے ہیں مگر اسکے بعد اور متحد ہو جاتے ہیں۔ یہ انتہائی معقول عمومی رویہ دہشت گردی کے خلاف ہماری آخری دیوار ہے۔ سب سے طاقتور دیوار!